itsurdu.blogspot.com

جرم آزادی.....جویریہ سلیم

میری عمر پندرہ سولہ سال ہوگی جب میں نے ہندوستان کے کے گلی کوچوں میں یہ نعرے سنے۔ ''لے کے رہیں گے پاکستان۔'' یہ مسلمانوں کا نعرہ تھا۔

''پاکستان کو بنا دیں گے قبرستان۔'' یہ سکھوں اور ہندوؤں کا نعرہ تھا۔

میں جب ''پاکستان زندہ باد'' اور لے کے رہیں گے پاکستان'' کے نعرے سنتی تو میرے من میں بھی جذبہ آزادی بیدار ہو جاتا اور میں گھر کی چار دیواری کے اندر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگتی۔ میں دن رات جاگتے ہوئے بھی سوتے ہوئے بھی پاکستان زندہ باد کے الفاظ سنتی اور ساتھ ہی آزادی کے خواب بھی دیکھتی۔

وہی زمانہ تھا وہی لوگ تھے۔ گلیاں بازار مرغزار سب وہی تھے' وہی اللہ دین حلوائی کی دکان' برابر میں تائی اللہ رکھی کا مکان' سامنے بڑا سا کھیل کا میدان' میدان کے اس طرف مسجد' مسجد کے اندر اور باہر ہزاروں پروانوں کا اجتماع۔ نعرے پر نعرہ۔ ''بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ بن کے رہے گا پاکستان۔''

نعروں کی گونج سے دھرتی کانپ رہی تھی۔ شاید فلک بھی تھرتھرا رہا ہو۔

جانے میرے دل کو کیا ہوا..... میں بھی جھٹ سے ہجوم میں داخل ہوگئی۔ اس ہجوم کے درمیان ایک بڑی سی تصویر تھی۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا۔

''یہ تصویر کس کی ہے بھائی؟''

''قائداعظم محمد علی جناح۔'' کی اس نے مکا تان کر کہا۔

میں ڈر کر پیچھے بھاگی لیکن مکا تو وہ ہندو بنئے اور دھرتی حاکموں کو دکھا رہا تھا۔ میں نے بھی دونوں مکے تان لیے اور ایڑیاں اٹھا کر زور سے نعرہ لگایا۔ ''پاکستان زندہ باد' ساری فضا گونج اٹھی۔ ''پاکستان زندہ باد..... زندہ و پائندہ باد۔'' پھر مسلمان کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے۔ مسلمانوں کی دہاڑ سے تقدیر بھی تو خوف کھاتی ہے۔ بنیا اور انگریز کیوں نہ جھکتے وہ جھک گئے اور غلامی کی سیاہ شب کٹ گئی۔ 14 اگست 1947ء کو سورج نکلا تو آزادی کا پیام لے کر۔

اس دن میں بہت خوش تھی۔ میرا دل سرشار تھا۔ میری روح خوش تھی اور سب سے بڑھ کر میرا ایمان سرشار تھا۔ اپنے گھر کی کسے خوشی نہیں ہوتی۔ سب اہل وطن خدائے بزرگ و برتر کے حضور سربسجود تھے۔ ''بغل میں چھری..... منہ میں رام رام'' بننے کی گھٹی میں یہ بات پڑی ہے۔ آہنسا کے پجاری جنگل کے درندوں سے بھی بڑھ گئے۔ آگ اور خون کی اس ہولی میں کیا کچھ نہیں لٹا۔ میرے باپ کو ہزاروں نمازیوں کے ساتھ حالت نماز میں ذبح کر دیا گیا۔ میں نے آنسو نہیں بہائے تھے۔ یہی تو رسم شبیری تھی۔

ان ہی دنوں میرا ایک بھائی دنیا میں آیا تھا۔ بلوائیوں نے میری ماں کی چھاتیاں کاٹ ڈالیں۔ دودھ اور خون ملا تو شفق کی سرخی شرما گئی۔ پندرہ دن کے معصوم بچے نے نیزے پر چڑھ کر زبان خاموش سے صبح آزادی کا شکریہ ادا کیا۔ پھولوں کی پنکھڑی سے بھی نرم و نازک ہاتھ اوپر اٹھا۔ سر تھوڑا سا نیچے ہوا اور گل رنگ سویرے نے آگے بڑھ کر سلامی لے لی۔

میرا جذبہ عشق شاید کچھ زیادہ تھا جبھی تو سزا بھی بڑی ملی۔ ان کے نہ جانے کیا کیا نام تھے لیکن تھے تو سب سکھ اور ہندو۔ انہوں نے مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے جا کر زنجیروں سے باندھ دیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دائیں طرف دیکھا..... ایک لمبی قطار تھی جوان شہزادیوں کی۔ بائیں طرف بھی یہی حال تھا۔ زیادہ نہیں تو کم از کم سو سے اوپر میری بہنیں' میری قوم کی بیٹیاں طارق' خالد' قاسم غزنوی کی بیٹیاں..... بے حال زخموں سے نڈھال چہروں پر خوف لیکن آنکھوں میں آس کی چمک..... میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پتہ نہیں کیوں؟

سامنے میرے اللہ کا گھر..... میرے نبی ﷺ کا شہر تھا۔ میرے دل کا دیا جل اٹھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور لگی انتظار کرنے آنے والے وقت کا۔

وہ آئے سب کو دیکھا بھالا' ان کے آگے جو تھا شاید ان کا سردار تھا۔ اس نے کرپان دوبارا اوپر نیچے لہرائی پھر بھوکے بھیڑیے کی طرح چلایا۔

''بولو..... پاکستان۔'' وہ آگے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے پوری قوت سے زندہ باد کا نعرہ لگا دیا۔ یہ سن کر پہلے تو وہ بوکھلا گیا پھر بدمست ہاتھی کی طرح میری طرف لپکا۔ اس کے آگے کیا ہوا؟

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

میں نے اپنا سب کچھ ہار دیا۔ جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی بربادی پر روؤں لیکن آنکھوں کے سامنے ایک سبز ہلالی پرچم لہرانے لگا۔ میں نے شرم وحیا کی چادر سے ایسا ہی ایک پرچم تخلیق کیا۔ آرزوؤں کے خون سے اس کے بیچ چاند تارا بنایا اور سوہنی دھرتی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے!''

اس جہنم سے مسجدوں کے شہر اور سنہرے ریشے کے دیس کے دل ڈھاکہ..... میں جس طرح پہنچی پہنچ ہی گئی۔ یہاں ایک بوڑھے نے مجھے اپنی بیٹی بنالیا۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ پھر میں ماں بن گئی۔ ایک ننھے منے گول مٹول خوبصورت بچے کی۔ بچے کے باپ کا نام مجھے معلوم نہیں۔ لیکن مجھ سے جس نے بھی بچے اور اس کے باپ کا نام پوچھا میں نے بتایا۔ ''پاکستان۔''

اور میں کہہ بھی کیا سکتی تھی؟

شروع شروع میں مجھے بہت نیند آیا کرتی تھی۔ چین کی نیند..... شاید اس لیے کہ چمن پھل پھول رہا تھا' ہر سو بہار تھی خزاں کا نام ونشان تک نہ تھا اور آنے والا دور بہت پر امید تھا لیکن یہ مسرت یہ آسودگی غم خزاں سے یہ بے نیازی بہت جلد دم توڑنے لگی۔ راتوں کو ڈراؤنے خواب ستانے لگے اور دن کو ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات جی جلانے لگے۔ میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ میں نے اپنے بچے کا گوشت کھالیا ہے۔ نمک مرچ لگا کر۔

صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ شہر میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ دوپٹہ سنبھالتی میں باہر کو بھاگی۔ وہاں بہت سے لوگوں نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ کوئی لاٹھی سے اسے پیٹ رہا تھا اور کوئی لاتوں اور گھونسوں سے۔ مجھے اس بے چارے پر بہت رحم آیا۔ آخر وہ میرے دیس کا باشندہ تھا۔ میرے نبی ﷺ کا امتی تھا۔ وہ بھی میرے بھائی تھے۔ ''بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے لیکن کیوں؟''

مجھے بتایا گیا۔ ''یہ پنجابی ہے۔'' وہ بہت کچھ کہتے رہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک گھر کے مختلف افراد ایک دوجے کے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟ گھر تو نام ہے محبت خلوص اور ہمدردی کا۔ ایک دوسرے کے دکھوں میں کام آنے کا۔ ایک دوسرے کی خوشی پر مسکرانے کا۔ یہی تو اچھے گھروں کے اصول ہوتے ہیں۔ خدا جانے اپنی قوم کو عقل کب آئے گی؟ کہیں پانی سر سے گزر ہی نہ جائے۔ ایک وہم سا دل کو چھیدتا ہوا آنکھوں تک جا پہنچا اور میرے آنسو نکل گئے۔

بعد میں جو کچھ ہوا کاش میں وہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے ہی مر جاتی۔ میرا وطن میرا دیس اور چمن میری جنت میری آنکھوں کا نور..... میرے دل کا سرور..... میرا مشرقی پاکستان..... میرا بنگال میرا ڈھاکہ میرا سلہٹ..... غرض پاکستان کے انگ انگ میں آگ بھڑک اٹھی اور بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگا۔

اس دن تو غضب ہو گیا جب میرے مسلمان پاکستانی بھائیوں نے اپنے سبز ہلالی پرچم کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ قائداعظم کی تصویر کو آگ لگائی' پاکستان زندہ باد کے بجائے ''جئے بنگلہ'' کا نعرہ لگایا۔

مجھے بڑا ہی تاؤ آیا۔ جواب میں چھت پر چڑھ کر میں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا تو وہ دوڑے دوڑے آئے..... مار پیٹ تو خیر ہونی ہی تھی اور مجھے اس کا غم بھی نہیں..... رونے کی بات تو یہ تھی کہ چوبیس سال پہلے ایک ہندو نے میری عزت لوٹی تھی اور آج چوبیس سال بعد ایک مسلم بھائی کے ہاتھوں میں پھر لٹ گئی۔ کچھ کم قیامت ہے یہ؟

اس صورت حال سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ حواس جواب دینے لگے اور زندگی موت سے بدتر ہو گئی۔ ایسے میں..... میں نے صدق دل سے مر جانے کی دعا کی لیکن موت نہ آئی۔ سوچتی ہوں اس وقت مر جاتی تو بعد کے یہ طوفان کون دیکھتا؟ میرا مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیا بنا کہ گلیوں اور بازاروں میں ''جئے ہند..... جئے اندرا..... جئے مہاتما گاندھی۔'' کے نعرے گونجنے لگے۔ نعرے لگانے والے مسلمان تھے۔ اپنے سینوں پر اندرا اور گاندھی کی تصاویر سجانے والے کلمہ طیبہ پر ایمان لانے والے تھے ان کے نام عمر' ناصر' قاسم' طارق اور خالد ہی تھے۔

اس شہر آرزو میں اپنوں کے طفیل اس اللہ کی بندی نے جیل بھی دیکھی۔ جیل کے نام پر ہر شریف آدمی کو خوف آتا ہے لیکن یہاں تو بات ہی الٹی تھی۔ کوئی چور اچکا اور بدمعاش پابند سلاسل نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ لاکھوں انسان جنہیں پاکستان کے نام سے محبت تھی یہاں مشق ستم بنے ہوئے تھے۔ تنگ وتاریک بستی ظلم وستم کے سائے کئی بار جی چاہا کہ کہیں سے سبز ہلالی پرچم نظر آئے لیکن جب چمن ہی لٹ گیا تو بہار کیسے آئے۔ سو دل کی تمنا دل ہی میں رہی۔

اسیری کے دن بیت رہے تھے۔ ایک دن ایک آدمی جیل میں آیا۔ اس کا آنا قیامت سے کم نہ تھا۔ ہر طرف شور مچ گیا..... بھاگو..... جان بچاؤ بھاگ تو میں بھی پڑی لیکن بھاگتے بھاگتے یہ بھی پوچھ ڈالا۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

''کون آیا ہے؟''

''مکتی باہنی کا نمبر دو لیڈر..... جو آدمیوں کو کچا کھا جاتا ہے۔ ماں بہن کسی کو نہیں سمجھتا۔ سنا ہے اب تک ہزاروں آدمی مار چکا ہے۔ اپنے گھر میں انسانی کھوپڑیوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے اس نے۔''

دھیان پتہ نہیں کدھر تھا۔ پاؤں نے ٹھوکر کھائی اور میں زمین پر ایسی گری کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ سر سے خون بہہ نکلا۔ قمیض سے تھوڑا سا کپڑا پھاڑ کر پٹی باندھنا چاہی تو کسی کے قہقہے فضا میں بکھر گئے۔ زندگی میں یوں ہنستے کسی کو نہ دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان ہنس رہا ہو، زمین ہنس رہی ہو، فضا ہنس رہی ہو لیکن کس کے لیے اور کیوں ہنس رہے ہیں یہ سب.....؟

ابھی میں خیالات کا تانا بانا ملا ہی رہی تھی کہ ایک زوردار ٹھوکر میرے پیٹ میں لگی۔ درد کے مارے میری تو جان ہی نکل گئی۔ سر چکرا گیا اور میں اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔ بعد میں کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

ہوش آیا تو اپنے آپ کو شاندار کمرے میں پایا اور وہی کچھ نظر کے سامنے تھا جو میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کارنس پر سجی ہوئی گاندھی کی تصویر، بڑے سے گلدان میں پھولوں کے درمیان لہراتا ہوا چھوٹا سا ترنگا..... گلدان کے اوپر لکھا ہوا ''گاندھی باپو زندہ باد۔'' قائداعظم کی مورتی..... ان کے پیٹ میں دھنسا ہوا خنجر..... میرا خون پھر کھول اٹھا۔

مجھ میں اٹھنے اور چلنے کی ہمت تو نہیں تھی لیکن گرتی پڑتی اپنے قائد کی مورتی کے پاس پہنچ گئی۔ نہ جانے میرے دل کو کیا ہوا..... میں بے اختیار مورتی سے لپٹ گئی۔ بے جان مورتی تھی لیکن میرے دل کو ایک سکون سا مل گیا۔ ''میرے قائد! میرے باپ مجھے بتا میں کہاں جاؤں؟'' میں نے چیخ چیخ کر پوچھا۔

پاکستان کی محبت کو اپنی روح میں بسا لے لڑکی جب تک زندگی ہے۔ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگائے جا۔

میرے احساس نے قائد کی جانب سے جواب دیا۔ اب میں نے ایک پل بھی ضائع نہ کیا اور پوری قوت سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا دیا۔ خدا کی قسم بڑا مزہ آیا۔ اور پھر میں نے نعرے پر نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ ایک بھونچال سا آ گیا۔ در و دیوار کانپنے لگے۔ ترنگا نیچے جلتی ہوئی آگ میں جا گرا۔ مہاتما کی مورتی فرش پر ایسے گری کہ دو حصوں میں بٹ گئی۔

لیکن اتنی دیر میں وہ بھی پہنچ گیا..... وہی جو مجھے جیل سے لایا تھا۔ آتے ہی اس نے انگیٹھی سے انگاروں کی مانند چمکتی ایک لمبی سی سلاخ نکالی۔ اتنی گرم کہ مجھے دو قدم دور کھڑے بھی پسینہ آ گیا۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹی لیکن وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے سلاخ ہوا میں لہرائی اور مجھے اپنا دایاں گال جلتا ہوا محسوس ہوا لیکن اب گال کی فکر کسے تھی۔ انگ انگ جل رہا تھا۔ میں فرش پر گر پڑی۔ اس نے سلاخ پھینک دی اور لگا میرے کپڑے نوچنے۔ میں مادر زاد برہنہ ہو گئی۔ اسی کشمکش میں وہ کپڑا جس سے اس نے اپنا منہ کافی حد تک چھپایا ہوا تھا ایک طرف کو سرک گیا۔ اب جو صورت میرے سامنے تھی میری جانی پہچانی تھی۔ میرا پڑوسی عبدل جسے میں عبدل بھیا کہہ کر پکارتی۔ میری عزت کے درپے تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔

''اوئے عبدل اپنی بہن کو نہیں پہچانتا؟''

''پہچان کے ہی یہاں لایا ہوں..... آج عیش کروں گا کیا سمجھی؟''

''آگے میں کیا جواب دیتی..... سفید خون مردہ دل۔ میں ان دنوں پھر ماں بننے والی تھی۔ میں نے عبدل کو بتایا کہ شاید اسے میری حالت پر رحم آئے لیکن اسے رحم نہ آیا۔ میں تڑپتی رہی، سسکتی رہی نیم بسمل پنچھی کی طرح۔ وہ ہوس کی پیاس بجھاتا رہا۔ اپنی منہ بولی بہن کے ساتھ اس نے منہ کالا کیا۔ ایک ماں کے ساتھ۔ ایک مجبور و بے کس عورت کے ساتھ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ بے شمار بت ہونٹوں پر مکروہ تبسم لیے مسکرا رہے تھے۔ عبدل بھی مجھے بڑا سا بت نظر آیا۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے جواب میں اپنے مکروہ لمبے لمبے دانتوں سے میرا چہرہ نوچ لیا۔

اب مجھ میں مزید سکت نہیں تھی۔ میں بے ہوش ہو گئی اور جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو خون میں لت پت اسی جیل میں پایا جہاں سے وہ ظالم مجھے لے کر گیا تھا۔

جیل میں پانی کئی دن سے بند تھا۔ نیم جاں تو میں پہلے ہی تھی اوپر سے بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ گیا۔ پانی پانی کرتے میرا حلق سوکھ گیا۔ جان لبوں پر آ گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور زبان گنگ ہو گئی۔ کان البتہ کچھ سن سکتے تھے۔ اناؤنسر ہم وطنوں کو آزادی کی سالگرہ کی مبارک باد دے رہی تھی آج پھر اگست کی 14 تاریخ تھی۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

اف میرے خدا..... ستم پر ستم۔ سارا بدن کانپ اٹھا۔ کچھ یاد نہیں اس کے بعد کیا ہوا؟ اوسان بحال ہوئے تو رات کا دیوتا فلک کی گود میں مسکرا رہا تھا لیکن میرے اردگرد بہت سے لوگ رو رہے تھے۔ مرد بھی' بچے اور بوڑھے بھی۔ اس رونے کی وجہ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آئی پھر جو دائیں کروٹ لی تو سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نظر آئی۔

غور سے دیکھا تو گوشت پوست کی ایک معصوم مورت دکھائی دی۔ مجھے اپنا دل پہلو سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔ کچھ میرے جیسا چہرہ تھا۔ ہونٹ اور ناک تو ہو بہو میری طرح تھی آنکھیں بھی اپنی ہی نظر آئیں۔ شدت غم سے میں تو پاگل ہو گئی۔ اس چاند سے چہرے کے اتنے بوسے لیے کہ اس کی نرم نرم کھال ادھڑنے لگی۔ پھر انہوں نے میرا لال مجھ سے چھین لیا البتہ میرے کہنے پر اسے جیل کی سب سے اونچی جگہ لے گئے تاکہ کہیں سبز ہلالی پرچم نظر آئے تو اس کی ایک جھلک معصوم کو دکھا دیں۔ وائے افسوس سبز ہلالی پرچم کہیں نظر نہیں آیا۔

عمر بڑھتی گئی زندگی گھٹتی گئی۔ ہم میں سے اکثر کو اب اس زندگی کی ضرورت نہیں تھی البتہ موت کا انتظار تھا۔ صبح و شام اس کی راہ دیکھتے تھے لیکن انسان کے چاہنے سے موت کب آتی ہے۔ وہ تو من مانی کرتی ہے اور پھر ایک دن ہمیں پتہ چلا کہ پرسوں ہم میں سے ڈیڑھ سو کو پاکستان جانا ہے۔''

میرا نام پہلے گروپ میں تھا۔ میرا سر خود بخود بارگاہ رب العزت میں جھک گیا۔ جھکی ہوئی کمر سیدھی ہو گئی۔ آنکھوں میں آرزوؤں کے دیپ جلنے لگے۔ دل کے چمن میں بہار آتی نظر آئی تو سیروں خون بڑھ گیا۔ ایک نئے جذبے کے ساتھ۔ ڈھیروں ارمانوں کے ساتھ میں بحری جہاز میں سوار ہوئی۔

پاکستان ..... پاک لوگوں کا گھر..... پاک دل ..... پاک روح .....امن کی چھاؤں.....انصاف کا سمندر..... باہمی محبت کا شجر..... پر بہار..... انسان کا مسکن۔'' میرا دل یہی کہتا اور سوچتا تھا۔

جب میں عروس البلاد کراچی میں اتری تو ایک اور ہی سماں نظر آیا۔ میں نے ہر چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ ہر آنکھ میں جھانک کر دیکھا۔ احساس کی لہر دل تک اتر گئی لیکن وہ محبت پیار خلوص اپنائیت جس کی میں متمنی تھی نظر نہ آئی۔ ہر روپ کے پیچھے بہروپ' ہر چہرہ نقلی ہر ادا دلفریب بظاہر پھول اندر سے کانٹے۔ صورت رہبر اندر سے رہزن خدا خوفی سے بے نیاز' دولت کے بندے۔ جو سنا تھا جو سوچا تھا اک سراب تھا۔ آس کی شمع بجھ گئی۔ تمناؤں کا خون کیا ہوا دل بھی خون ہو گیا۔

یہاں ایک آدمی نے مجھے بہن کہا۔ ایک بزرگ تھے جنہوں نے مجھے بیٹی بنا لیا۔ ایک عورت میری ماں بن گئی۔ رہنے کو اک گھر مل گیا لیکن رات کو اس مہربانی کی قیمت یوں وصول کی کہ ایک آدمی کے ہاتھ مجھے بیچ دیا گیا۔ وہ آدمی خریدار کم سوداگر زیادہ تھا۔ اس نے بھی منافع کما کر میرا سودا کر دیا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ کتنے آدمیوں نے مجھے بیچا۔ کتنے آدمی میرے خریدار بنے۔ ایک دو بار نہیں بلکہ کچھ اتنی بار مجھے لوٹا گیا کہ لٹنے کا احساس ہی نہ رہا۔ آخر کار ایک بہت بڑے آدمی نے مجھے خرید لیا اور ایک بڑی حویلی میں لے گیا۔ اس حویلی میں ہر کوئی ننگا نظر آیا۔ ہر دامن چاک۔ ہر صورت مکروہ۔ گھنگھروؤں کی جھنکار۔ ہوس کے خریدار۔ اب میری مثال اس لاش کی سی تھی جسے بے دردی سے کتوں' کوؤں اور چیلوں نے نوچ ڈالا ہوا۔

اس دن اگست کی چودہ تاریخ تھی۔ پوری قوم یوم آزادی منا رہی تھی اور میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ منہ سے خون جاری ہو گیا۔ چہرے پر موت کے سائے سے خون جاری ہو گیا۔ چہرے پر موت کے سائے منڈلانے لگے تو وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر کے کلینک میں ہی میں نے ایک بچی کو جنم دیا۔ کاش میں مر جاتی لیکن میری رات کی سحر شاید ابھی دور تھی کہ میں زندہ رہی۔

میرا مالک اب میری اچھی طرح دیکھ بھال کرنے لگا۔ ادویات لانے لگا۔ ہر دوسرے تیسرے دن مجھے ڈاکٹر کو دکھانے لاتا مگر مجھے اب زندہ رہنے کی آرزو نہ تھی۔ جس روز میری بیٹی بانو پیدا ہوئی تھی میں نے اپنے قائداعظم سے پوچھا تھا۔ ''اے بانی پاکستان مجھے اور کتنی بار بغیر شادی کے ماں بننا پڑے گا؟''

یہی سوال میں ہر پاکستانی سے پوچھتی ہوں۔ ہے کوئی جو مجھے بتا سکے۔ اے چودہ اگست تو ہی بتا دے.....اس افسانے کا انجام مجھے۔''

میری ماں بانو نے مجھے اپنی ماں کی لہو رنگ داستان 1990 میں سنائی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ زندگی سے ناتہ توڑ گئی تھی۔ اس کا مالک اور مالک کا باپ بھی اس دنیا میں نہ رہا مگر ان کی جگہ ان کی اولاد نے لے لی۔ اس کے دو بیٹے بھی اس جیسے ہی نکلے۔ میں نے اس

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

حویلی سے نکلنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ میں اب بھی ان وڈیروں جاگیرداروں اور بدمعاشوں کی اس حویلی میں رہتی ہوں۔ ماں اور نانی کی طرح ان کی بے دام غلام ہوں۔ میں اب بھی غلامی کی ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ جب بھی چودہ اگست کی تاریخ آتی ہے تو مجھے اپنی نانی بہت یاد آتی ہے اور میں بھی یہ آس لگا لیتی ہوں کہ شاید مجھے بھی آزادی نصیب ہو جائے۔ مگر نہ جانے میرے لیے چودہ اگست کب آئے گی؟ نہ جانے کب؟

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com